ڈاکٹر فرحت جبیں ورک*

ناول "گرد باد" میں سماجی اقدار کا حسیاتی وحساسیتی تجزیہ

Abstract: *Emotions and feelings function in unison for adapting the sensations and emotions into specific mold.The cultural and psychological analyzes of the increasing details of sciences have not only increased the responsibilities of a writer and poet but also have opened the knot of psychiatric behavior of common man for the reader.*

The style of novel "Gardbad" (whirlwind) of Mohammad Atif Haleem, the narrative of the characters, represent the rural culture of the Punjab, along with the depiction of the intensity of sensitivity of the novelist through specific psychology and sensuality. The novel with its symbolic and abstract style of writing has very ably kept the tradition of sculpturing the persons and their narratives in duality of village and culture. This novel with its abstract style seems to be a link between the tradition (Nairang-e-Khayal) and innovation (Gardbad) due to its abstract style. The expression of the verdicts of the traditional punchayats in Punjab and inhuman means of their implementation is dominant with full force in "Gardbad" in a question form in the treble of the past, present and future."Gardbad" is symbolic imagination such that when someone is treated as abnormal and forced exit from "mother earth", the face of the cities start to disfigure and the name of the culture is plagued. In the novel, rural and urban cultural mechanisms are so strong that they always awaken the sensory powers (seeing, listening, smelling, and touching) of the readers'. The combination of the local dialect and the complete cultural get-up of the characters of the story give the rich cultural gateway in the story language gives rise to a living sensitivity."Gardbad" is a big question on the sensual and sensory levels for conscious human society.

علوم کی بڑھتی ہوئی توضیحات کے بدلتے ہوئے ثقافتی ونفسیاتی تجزیوں نے جہاں ایک ادیب وشاعر کی ذمہ داریوں میں اضافہ کیا ہے وہیں قاری کے لئے عام انسان کے نفسیاتی رویوں کی بھی گرہ کشائی کی ہے۔

* صدر، شعبہ اُردو، فاطمہ جناح ویمن یونیورسٹی، راولپنڈی

بقول ڈاکٹر وزیر آغا:

"بیسویں اور اکیسویں صدی میں ہونے والی سیاسی، سماجی و معاشی تبدیلیوں نے ثقافتی تجسیم و تفہیم کے سلسلے میں بڑی مدد دی ہے۔ انسانی زندگی میں پیش آنے والے خاص واقعات کے پس منظر میں عام معمولاتِ زندگی میں ہونے والی چھوٹی بڑی لغزشیں ہیں کہ جو انسانی پست ہمتی کو بامعانی افعال و قول میں ڈھالتی ہے۔ انسانی حیات اپنی ذات کے اثبات کے لئے پروانہ وار کبھی عقلی و منطقی دلائل سے روگردانی کرتا ہے تو کبھی اپنے اندر کی سچائی سے احساس کو مشعلِ راہ بناتا ہے۔ انسانی زندگی میں احساس وحسیات، اسے جذباتی و روحانی طور پر اپنے ماحول، رہتل، ثقافت اور یہاں تک کہ روز مرہ زندگی سے مربوط و منسلک کرتے ہیں۔ مگر اس میں پڑنے والی دراڑیں پورے سماج کی حقیقت کو بے معنوی سوالیہ بے ترتیب بنا دیتی ہیں۔" (۱)

حسیات کو مخصوص پیکر میں ڈھالنے کے لئے جذبات و احساسات کار فرما ہوتے ہیں۔ علوم کی بڑھتی ہوئی توضیحات کے بدلتے ہوئے ثقافتی و نفسیاتی تجزیوں نے جہاں ایک ادیب و شاعر کی ذمہ داریوں میں اضافہ کیا ہے وہیں قاری کے لئے عام انسان کے نفسیاتی رویوں کی بھی گرہ کشائی کی ہے۔ محمد عاطف علیم کے ناول "گردباد" کا اسلوب، کرداروں کا لب ولہجہ، پنجاب کی دیہی ثقافت کے تناظر میں ناول نگار کی مخصوص نفسیات وحسیات کے ذریعے اس کی حساسی شدت کی غمازی کرتا ہے۔ اس ناول کے علامتی و فلیش بیک انداز تحریر نے فرد و کلامیہ، جمع گاؤں اور ثقافت کی ثنویت سے کرداروں کو مجسم کر دینے کی روایت کو بخوبی پیش کیا ہے۔ یہ ناول اپنے مخصوص تناظر میں سے روایت کے تسلسل اور جدید طرزِ حیات کے باطن پر جمی کائی پر ضرب کاری کا بیانیہ ہے۔ جس میں پنجاب کی مخصوص جاگیردارانہ ثقافت، روایتی پنچایت کے فیصلوں اور اُس پر عملدرآمد کے حیوانی طریقوں کا کلچر ہنوز سوالیہ نشان ہے۔" محمد عاطف علیم کے ناول "گردباد" کا اسلوب، کرداروں کا ثقافتی لب ولہجہ، پنجاب کے پنچایتی کلچر کے زخمی بطن کا نوحہ ہے۔ جسے ناول کا بیانیہ جگ بیتی سے زیادہ ہڈ بیتی کے احساس سے نمکین کر دیتا ہے۔ اُس کی دلیل ناول نگار کا موجو موچی عُرف موج دین کے ظاہر و باطن کی تکالیف کو رمز و کنایہ میں بیان کرنے کے انداز سے عیاں ہے جبکہ شمو کنجری کی تکالیف کا بیان، قاری کے ذہن کو شمو کی اذیتوں کے ساتھ ساتھ جھرانے اور کپکپانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ناول نگار پنچایت کے اس انسانیت سوز فیصلے پر کچھ یوں ماتم کناں ہوتا ہے۔

"۔۔۔تب جلوس کی ایک ٹکڑی شمو کو الگ کر کے کہیں اور لے گئی اور دوسری ٹکڑی مجھے ڈیرے پر لے آئی۔۔۔ لیکن جو ڈیرے پر میرے ساتھ ہوا اُس کی بھی مجھے خبر نہیں کہ میں نے باہر کا احوال باہر چھوڑا اور اپنے اندر سی کنویں میں چھپ کر بیٹھ گیا۔۔۔ ایسی ہی ایک سنسان گلی کے ایک بند دروازے کے باہر اسے چھوڑ دیا گیا ۔۔۔ اُس نے ہمت باندھی اور اندر داخل ہو گیا۔۔۔ وہ سامنے چارپائی پر چت پڑی تھی۔ شلوار زمین پر تھی اور قمیض شانوں تک چڑھی ہوئی تھی۔ اُس کی ٹانگیں تا حدِ امکان کھلی ہوئی تھیں اور خون کا ایک بڑا دھبہ ایک ران پر جما ہوا صاف دکھائی دے رہا تھا۔" (۲)

انسانی وجود کے درد و غم کو شناخت کرنے میں مقامی کلچر و علاقائی ثقافت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ یہ دیہی تمدنِ ارضی ہی تھا کہ جس میں موجود موچی کی نفسیات میں اپنے کمیں ہونے کا احساس قاری کے شعور میں بھی کمیں ذات کے تصور کو اسی ذلت آمیز تابعداری کے مرقع کے طور پر اُبھارتا ہے مگر شمیم اختر عُرف شمو کے کردار میں عورت کے وجود کو ملنے والی اذیت و برہنگی کا احساس مجسم ہو جاتا ہے، جب ناول نگار عورت کا حوصلہ ارادتاً بلند دکھاتا ہے۔ عورت کی ذات و کردار ہمیشہ ایک معمہ ہی رہا ہے۔ صنفِ نازک کی تاریخی حقیقت شاہد ہے کہ عورت سماجی ظلم و زیادتیوں کو کس طرح پالتی اور قدرت کی مہربانی کی منتظر رہتی ہے۔ مردوں کے سماج نے مرورِ ایام کے ساتھ ساتھ عورت پر برتری حاصل کرتے کرتے، اُسے اپنے اپنے سماجی رویوں کے مطابق مقام دیا۔ بقول ڈاکٹر مبارک علی: "جیسے جیسے جسمانی طاقت و قوت کا استعمال بڑھتا چلا گیا، ایسے ایسے مرد کی برتری قائم ہوتی چلی گئی اور عورت کا سماجی مرتبہ گرتا چلا گیا"۔(۳) ایک کمیں کی باطنی حساسیت اور دیہی ثقافتی رنگ نے کہانی کے تسلسل کو جانداری و ربط بخشا ہے۔ اِس کی اصلی رنگت نے سماج کے غازے کو یوں بلیچ کیا ہے کہ سماجی رویوں کی سیاہی و سفیدی پر گھڑوں پر تیزاب پڑ جاتا ہے۔ ناول میں اپنی شناخت کے درد میں مبتلا، سچائی کی تلاش بالآخر چراغے، موجو اور شمو کو خاندان کی بقا اور اپنے ہونے کے احساس کی بحالی کی خاطر شہر کا رُخ کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ یہ وہ تلخ حقائق ہیں کہ جہاں تخریب کے پہلو بہ پہلو سماجی تعمیر کھڑی ہے۔ طبقاتی تقسیم کی صورت بے وقعتی کے اہل ٹھہرنے والا وہ کمتر طبقہ جب شہر کا رُخ کرتا ہے اور جٹ شوز کے برانڈ اور تبلیغِ دین کی اہلیت کے ہمراہ سماج کو خود ترسی کے احساس سے نمکین کر دیتا ہے۔ اِسی درد کے احساس کو ناول نگار یوں بیان کرتا ہے:

> اور اب دولت اس کا منہ چڑانے کو اُس کے گھر آ دھمکی۔ اس کے ڈیزائن کردہ کچھ جوتے فیشن میں شامل ہو کر ہاٹ کیک بن گئے تھے۔ موجو موچی اب جٹ شوز نام کے برانڈ کا اونر تھا۔ کوٹ ہرا کی اس بیٹھک میں بیٹھا ایک گمنام فنکار اپنے فن کا صلہ پا چکا تھا۔۔۔ لیکن کس قیمت پر؟(۴)

ناول نگار نے ناول میں گاؤں کے کلچر میں چوہدری اور کمیں کے مابین بحوالہ جذب و آہنگی ایسا ثقافتی بُعد متعارف کروایا ہے کہ جو سماج میں بے شمار المیوں اور سانحوں کا باعث بنتا ہے۔ یہ ناول جہاں "سگو" اور "مگو" (دو کتے) کے کرداروں کی پیشکش سے علامت کے پیرائے میں انسان کی ہجوم میں تنہائی اور اجتماعی دوڑ میں فرد کی شناخت و گمشدگی کا آشوب ہے۔ وہیں وجودی حقیقتوں کا بھی بیانیہ ہے۔ دیہاتوں میں روایتی پنچایت کے فیصلوں اور اُن پر عملدرآمد کی حیوانیت کی بھینٹ چڑھنے والوں کی یہ کہانی، حقیقت پر مبنی معلوم ہوتی ہے۔ یہ اُس ہڈ بیتی کا احساس اُجاگر کرتی ہے کہ جس نے عورت کے وجود کو بہانہ بنا کر انانیت کی تسکین کی خاطر سماجی قدروں کو لہولہان کیا ہے۔

"گرد باد" میں ناول نگار نے حسیات کو مخصوص پیکر میں ڈھالنے کے لئے ایک "منافق عہد" کی لاحاصلی کے کرب میں مبتلا دیہاتی و شہری زندگی کی تشنگیوں کو بیان کیا ہے۔ کہانی کا آغاز ایک عام قاری کا دھیان فوراً ہجرت، فساد اور آفت زدہ علاقے کی طرف مرکوز کر دیتا ہے۔ صدیوں کا جما جمایا ڈیرہ تھا جو بکھرا تو یوں کہ تنکے کو تنکے کی خبر نہ رہی "۔۔۔۔کوٹ ہرا" اِس کے سینے میں برچھی سی گڑی۔۔۔ صرف ایک روز پہلے تک کوٹ ہرا اُس کا وطن تھا۔۔۔ایک چھوٹی سی دُنیا جو ایک سمجھ میں نہ آنے والی تعلق سفاکی کے ساتھ اس کی اپنی تھی"۔(۵)

کوٹ ہرا، موج دین عرف موجو، حکم آباد، چوھدری فلانا، ملک ڈھمکانا، طوطی جان، چراغ دین عرف چراغا، نیلی چڑیا، سگو اور مگو، ایسے علامیے ہیں کہ جو نیرنگ ِخیال (روایت) سے گرد باد (جدت) میں اپنی تہذیبی، معاشرتی، جذباتی، مادی، نفسیاتی اور ذاتی وابستگیوں کی بنا پر میل کھاتے ہیں۔ دیہاتی و شہری ہر دو زندگی میں انسان بیک وقت مداری بھی ہے اور تماشائی بھی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اگر فرد کسی کھیل کا تماش بین ہو تو کچھ باطنی سچائیاں اُسے یہ باور کرانے میں کامیاب ہو ہی جاتی ہیں کہ اُس کی ذات بھی اِس ذلت و تماشے کا حصہ بن رہی ہے۔ گناہ اور ظلم کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے والا سماج دراصل اپنے گناہوں کے سراغ اور دوسروں کے جہنم کا حصہ دار مقرر ہو جاتا ہے۔

کوٹ ہرا تا حکم آباد اور پھر لاہور شہر کا کلچر جیسے اپنے ہونے کے اثبات کی تلاش کے مجرد علاقے ہیں۔ جنھیں موجو اور چراغ دین جیسے استعاراتی کردار اپنے وجود کے اثبات کی خاطر بساتے اور آباد کرتے چلے جاتے ہیں۔ موج دین اپنی ہی موج میں رہنے والا، ہر مصیبت و جنجال کے ساتھ نبھانے والا (موجو) استعارہ ہے جبکہ چراغ دین، چراغ کی صورت وہ استعارہ ہے کہ جو موج دین کی زندگی میں جٹ شوز کی ملکیت و نئے سماجی شعور کی شنید بنتا ہے۔ موج دین اور چراغ دین جیسی، ایسی بہت سی خالص ثقافتیں ہیں کہ جن کو سامراجی ٹھیکیدار مسخ کرنے کے درپے رہتے ہیں۔ ایسی سُچی کھری ثقافتیں اپنے بدن کی میل شہروں میں کُھرچ کر پورے سماج کو گرد باد کی لپیٹ میں لے آتی ہیں۔ "موجو" کا کردار شمو کنجری سے اپنی ذات کا اثبات چاہتا ہے جبکہ "شمو کنجری" اپنی نفی میں اثبات کے پہلو کھوجتی کھوجتی اول "چوہدری فلانا" سے انتقام لینے نکلتی ہے اور پھر "ملک ڈھمکانا" کو جہنم واصل کر کے اپنی زندگی میں اصل معنی کی جستجو میں کامیاب رہتی ہے۔

ناول میں دیہی منفی اقدار و روایات دراصل اجتماعی زندگی کے سُکھ، فوائد و اثبات سے ناواقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ناول نگار نے ایک خاص واقعے کو "آنندی" کے مماثل رویوں کے طور پر عقلیت و جذبات سے عاری سماجی نظام کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ "حکم آباد" میں نظام اور اقتدار کا دار و مدار انفرادیت کی نفی اور ریاکارانہ عمل کا بیانیہ ہے۔ جس میں موجو سے کہیں زیادہ شمو کی نفسیات میں پلنے والے جنسی و جذباتی تحفظات، مجبوریاں، لاشعور کو شعور پر حاوی کر دیتی ہیں۔

ایک رنگین دھندلکا اور ایک انجان سے نشے کی بے انت اتھاہ۔ میرا خیال تھا کہ میرے بدن کی کوملتا اور اُس کی حیوانیت وہ آفاقی سچائیاں ہیں جو ہمیشہ باقی رہیں گی بس! لیکن یہ میری عمر کے کچے پن کا بہکاوا تھا جو تا دیر چلنے والا نہیں تھا۔ مجھے جلد ہی معلوم پڑنت والا تھا کہ کوئی کام بھی تا دیر نہیں کیا جا سکتا۔ کارِ دیوانگی بھی نہیں۔(۶)

ناول نگار نے یوں شمو کے کردار کے ذریعے عدم تحفظ کا شکار عورت کے جذبات، خدشات نیز آگہی کی محولہ بالا اقتباس میں چوھدری فلانا کے وجود نے تجسیم کر دی ہے۔

"گرد باد" میں بھی عورت کا کردار، اُس کی نفسیات، آرزوئیں ایک ایسا پُر اسرار جزیرہ ہے کہ جس کے کنارے سے مرد معاشرہ واپس پلٹ جاتا ہے جبکہ محمد عاطف علیم نے مرد و عورت کو ایک دوسرے کا دم ساز، ستر پوش بنانے کے لئے ناول کے پلاٹ پر خصوصی توجہ دی ہے۔ اِس کے لئے اکثر موجو کو ایسے منطقوں میں بھی جانا پڑتا ہے کہ جس کی بنا پر اصل اذیت میں افاقہ کی بجائے اضافہ لے کر لوٹتا ہے۔ دوسری طرف ثقافتی بیانیہ کے برعکس مرد کی نفسیات میں انتقام کی خواہش، عملدرآمد کے مواقع، عورت کو برابر میسر آنا، بے خدوخال ثقافتی بیانیے کو پُر معانی مواد بخشتا ہے۔

اُس نے شمو کے عورت ہونے پر لکیر پھیر دی تھی اور مجھ سے میرے مرد ہونے کا مان چھین لیا تھا۔ بتاؤ کوئی نفی کی حالت میں کیسے جی سکتا ہے؟ ہم بھی نہیں۔ ہم اپنی اپنی جگہ کڑھتے رہے اور سوچتے رہے اور پھر ہم نے جان لیا کہ ہمارا اثبات چوہدری فلانے کی موت کے ساتھ وابستہ ہو چکا تھا۔(۷)

زندگی میں ہونے والے ایک پنچایتی فیصلے نے دونوں حادثاتی میاں بیوی سے اُن کی شناخت ہی چھین لی۔ "موجو" ناول کا ایسا مرکزی کردار ہے کہ جس کا ذہن پنچایتی فیصلے کی عملداری نے ایسا منتشر کیا کہ وہ بیک وقت کئی قسم کے منطقوں اور دھاروں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ اِسی طرح شمو کی ذات شعوری و لاشعوری ہر دو سطحوں پر مختلف حیثیتوں اور کیفیتوں میں منقلب رہتی ہے۔ ڈاکٹر عابدہ نسیم، انسانی وجود کی شناخت کے ضمن میں کہتی ہیں کہ: " انسان زندگی بھر اپنے وجود کے شناخت کئے جانے کی تگ و دو میں مصروف رہتا ہے۔ وطن، زمین، ثقافت یہ سب انسانوں کے مابین وجود کی شناخت ہی کے مختلف مظاہر ہیں"۔(۸)

ناول میں غور طلب بات یہ بھی ہے کہ "چوہدری فلانا" اور "ملک ڈھمکانا" کو بلاشبہ قابلِ نفرت گردانتے ہوئے ناول نگار نے کوئی نام دینا بھی لائق اعتنا نہیں گردانا ہو گا مگر یہاں عام قاری کے لئے کتھارسس کی سپیس بھی فراہم کی گئی ہے۔ پنچایت کا فیصلہ اور اُس پر عمل درآمد کا حیوانی طریقہ بے اختیار ماضی، حال اور مستقبل کی تثلیث کا مظہر بھی ہے۔ کہ جہاں مختاراں مائی کا کردار یا کسی عورت پر ہونے والے ظلم و جبر کی داستان شمو کے کردار کو بآسانی Replace کر سکتی ہے۔ گرد باد حقیقت میں اُس وقت "شوکتا وحشی گرد باد" بن جاتا ہے کہ جب ناول نگار کی حساسی شدت (Intensity) اِس طرز پر بڑھتی ہے کہ وہ مقامی لب ولہجے کی اُردو اسلوب میں آمیزش اور پنجابی گالیوں کا بے

ساختہ اظہار ثقافتی بیانیہ (Cultural Discourse) کے اظہار میں اپناتا ہے۔یہی وہ بے اعتمادی اور انفرادی انانیت مجروح ہونے پر اظہار ہے کہ جو سماجی رویوں کو مفاہمت واندیشہ سود وزیاں کا احساس دلاتا ہے۔

چند مثالیں:

"دُر فٹے منہ تیرا بھی وئی۔ یہ موجو تھا جو خود کو کوس رہا تھا۔۔۔ موجو اچانک سے انکشاف کی تمازت سے جُھلس اٹھا۔

تیری تو میں ماں کی۔۔۔وڑ گیا سامان شامان۔۔۔" (۹)

ناول کی کہانی میں ماضی خرابہ لئے ہوئے ہے تو مستقبل خدشوں بھرا۔ کوٹ ہراکی ثقافتی تجسیم اُس وقت مسخ ہو جاتی ہے کہ جب "موجو" جتی ستی موچی جو گاؤں سے اٹھایا جاتا ہے اور شہر کا کلچر اُسے کمیں جاتی سے اُٹھا کر جٹ شوز کا مالک بننے کے لئے سپیس فراہم کرتا ہے۔ناول "گرد باد" ایک فکری علامیہ ہے کہ جب "ماں مٹی" کے بطن سے کوئی وجود "ابنارمل" قرار دے کر نکلنے پر مجبور کر دیا جائے تو شہروں کے چہرے مسخ ہونے لگتے ہیں اور کلچر کے نام پر دھتکار پڑ جاتی ہے۔

بقول ڈاکٹر وزیر آغا: "جس معاشرے میں فرد بے نام، بے چہرہ اور بے گھر ہو جائے، وہاں زندگی پر یاسیت اور بے معنویت کا تسلط قائم ہو جاتا ہے" (۱۰)۔ موجو کا یوں بیک وقت دو منطقوں میں زندگی کی تلاش اور ماضی کی بازیافت کرنا، بنیادی طور پر اُس کی تپتی جاتی زندگی کو ایک قطرے میں بدل دیتی ہے جو کہ شمو (خاموش دریا) کے ماضی کے ساتھ ساتھ الجھتا اور بہتا چلا جاتا ہے اور نتیجہ ایک خرابے سے دوسرے خرابے تک افسردہ ساماں حقیقتیں چراغے اور اُس کی بیوی کی صورت منتظر ہوتی ہیں۔ یہ وہ ہڈ بیتی معلوم ہوتی ہے کہ جس میں سماجی قدریں، وجودی شناختیں اور انسانیت پر عدم اعتماد نے ہر چیز کو بے وقعت بنا دیا تھا۔ انسان کی عدل وانصاف کے نام پر اپنے ہم جنسوں کی تذلیل بنیادی طور پر اصل منصب وثقافت کی خالص روح سے بے خبری کی مسخ صورت میں سامنے آتی ہے کہ جہاں سماجی ٹھیکیدار مرد و زن کے روح و بدن کا نہیں بلکہ دیہی ثقافت کا بے دریغ بہیمانہ انداز میں قتل کرتے ہوئے اخلاقی و مذہبی حدود و قیود کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر مبارک علی:

> سماجی رسم ورواج کا تعلق دُنیاوی معاملات سے ہوتا ہے، ان کی بنیاد پر کوئی بھی معاشرہ اپنی اخلاقی اقدار کا تحفظ کرتا ہے۔ ان میں سے کچھ رسومات معاشرہ میں طبقاتی تقسیم کو اخلاقی رنگ دے کر اعلیٰ وادنیٰ کے فرق ک قائم رکھتی ہیں، خاص طور سے مردوں کی فوقیت کو قائم رکھنے میں ان کا عملی کردار ہوتا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ سماجی وثقافتی رسم ورواج مذہبی قوانین کے مقابلے میں لوگوں پر زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔(۱۱)

اپنی اصل سے بچھڑے ہوئے ناول کے کردار زندگی کی دی ہوئی عارضی رعایتوں سے بھی خوب واقف ہیں مگر محدودیت کے باوجود اپنی علیحدہ شناخت کے خواہاں بھی ہیں۔ عدم تکمیلیت، طبقاتی حصوں میں بٹے ہوئے سماج میں ہر کلاس کا المیہ ہے مگر اُس طبقہ انسانی کا قدرے زیادہ جو معاشی تقسیم سے بہت آگے باطن کے گھاؤ بھرتے بھرتے خود سے بھی ماوراہونے لگتے ہیں۔ گرد باد میں ماضی، حال اور

مستقبل کی ان بُنی کیفیتوں میں اخلاص کی صورت سگو، مگو اور نیلی چڑیا کے استعارے دَر آنا کسی منطقی توجیہہ کے متقاضی نہیں بلکہ سماجی اجتماعی فیصلوں کی تپش وہ انسانوں سے زیادہ محسوس کرتے ہیں اور اپنے مالکوں سے وابستہ صعوبتوں کو اپنا انفرادی و ذاتی تجربہ سمجھنے لگتے ہیں۔"تب ایک ہلکی سی ٹخ کی آواز آئی۔ موجو د نے پلٹ کر دیکھا تو اُس کے دونوں یار سگو اور مگو دروازے پر کھڑے تھے۔اِن کی دُمیں ہل رہی تھیں اور آنکھوں میں التجا تھی کہ چھوڑو دفع کرو، چلو اپنے گھر چلیں"۔ (۱۲)

ناول کا ثقافتی میکانزم تمام حِسوں بشمول قوتِ باصرہ، لامسہ، شامہ کو بیدار رکھتا ہے۔ مگر یہ تمام حساسیت انسان نما سماج کی بجائے جانور نما احساس کے پاس اشرف المخلوق کی نسبت بیدار ملے تو انسانی سماج میں سیاسی، سماجی و معاشی قدریں داغدار و بقاخطرے میں سمجھی جانا لازم ہے۔ یقیناً اِن حسوں کی بیداری سماجی شعور کی غماز ہیں۔ یہی وہ حِس ہے کہ جو انسان کو "کمیں" ہونے کی اذیت میں مبتلا کرتی بلکہ ذات کے انکار پر احتجاج اور اپنی حقیقت کے ادراک و اثبات کا راستہ سجھاتی ہیں۔ سماج دیہی ہو یا شہری، اِس میں دوئی کی صورت کو ختم کر کے سماجی وحدت کی تشکیل پر توجہ دینی چاہئے۔ وجہ شہری زندگی کی بقا گاؤں کے کلچر کا صحت مند رویوں میں پنہاں ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ انسانی جان سے زیادہ انسانی انا و عزتِ نفس کی بقا ضروری ہے۔ ناول کے وہ کردار کہ جو اس حالتِ جنگ میں ملتے ہیں وہ اخیر میں اپنی شناخت کی بقا کے لئے جان سے گزرنا قبول کرتے ہیں۔ ناول کا ایک اہم کردار "چراغ دین" اپنے وجود و شناخت کی کلیت کو یوں بتا تا ہے۔"مجھے مراثی ہونا قبول تھا لیکن مراثی ہونے کی سزا قبول نہیں تھی"۔(۱۳) پھر ایک جگہ موجو موچی اپنی ذات کی اہمیت و احساس کو یوں زبان دیتا ہے کہ

> میرا دل دھڑکنے لگا، نظریں پاؤں کے انگوٹھے اور انگلیوں میں پھنسے چمڑے پر گڑ گئیں اور سارا بدن کان اور آنکھیں بن گیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی اور میں سانس تھامے منتظر تھا یہ سننے کا کہ وہ میری ذات کا اثبات کرنے آئی ہے۔(۱۴)

یقیناً اِن تمام حِسوں کی بیداری انسان کو ہر ذہنی و جذباتی سہارے اور فریب کے چنگل سے نکالنے میں معاون ہوتی ہے۔ مگر یہ اُس وقت ثقافتی بیانیہ بنتی ہیں کہ جب مقامی زبان اور ثقافتی رنگ یکجا ہو کر کہانی کی تجسیم کریں۔ بقول فرخ ندیم: "وہی کہانی زندہ رہتی ہے جس کے کردار، رہتل، اور زبان مقامی ہوتی ہے۔" (۱۵) جب سماج میں دیہاتوں کی رہتل کی یہ تصویر سامنے آتی ہیں تو پھر صدیوں کے تربیت یافتہ اخلاقی تصورات پر انسانی منافقتیں حاوی ہو جاتی ہیں۔

معاصر زندگی جن تغیرات کو بطور روحانی غذا قبول کرتی ہے، اُن سے روگردانی ممکن نہیں رہتی۔ مگر ساتھ ہی ساتھ منتشر و فرسودہ ذہنیت معاشروں کو مہذب اسالیبِ حیات سکھانے کی بھی ضرورت ہے۔ گرد باد اِسی حقیقت کی نقاب کشائی کرتا ہے۔ موجو اور شمو کی مہربان دوست "نیلی چڑیا" کا کردار حقیقی زندگی کی مشکلات میں سہل پسندی کا استعارہ بن کر آتا ہے۔"میں منتظر تھا کہ وہ بولے اور کچھ ایسا بولے کہ آج زمین آسمان کی آغوش میں سما جائے۔ وہ بولی تو کھڑکی کے باہر دھریک کے درخت پر آبیٹھنے والی نیلی چڑیا اس کی مخاطب تھی۔"(۱۶)

دیہاتوں اور شہروں میں انسان نسلی و طبقاتی تقسیم کی ایسی حقیر آلودگی میں سانس لے رہا ہے کہ جس پر بے حسی و بے مروتی کی دبیز پرتیں جو چڑھی ہیں تو انسانی باطن میں روشنی کے روزن بند ہونے لگے ہیں۔ انسانی تاریخ گواہ ہے کہ ایسے معاشرے کی نبضیں جلد رُک جاتی

ہیں، جہاں سماجی قدریں احساس سے عاری ہوں۔ گرد باد میں موجو اور شمو کے لئے اپنی اپنی ذات کا اثبات دراصل دیہاتی زندگی کو اخلاقی آلودگی سے نجات دلانا ہے۔

موجو ریزہ ریزہ وجودی طاقتوں کو مجتمع کر کے شمو کے ساتھ ایک شاداب ذہنی و جذباتی زندگی کا خواہاں ہے۔ مگر شمو کے لئے موجو کا کردار صرف سانجھی دشمنی کو ایمانداری کے ساتھ نبھانے کا منتظر ہے۔ چراغ دین سماج سے بدلے میں من چاہی قیمت وصول کرتا ہے مگر شمو اپنی ذات کا اثبات۔ محمد عاطف علیم نے مشترکہ نفرتوں کے رشتوں کو بھی سانجھے مفاد جیسا معتبر بنا دیا ہے۔ "اب کم از کم ایسا ضرور نظر آتا تھا کہ ہم ایک دوسرے کے کچھ لگتے ضرور ہیں۔ اِس کے باوجود یہ ایسا رشتہ تھا جو تھا بھی اور نہیں بھی"۔(۱۷)

مگر ساتھ میں ہی موجو کا کردار پوری ایمانداری سے اپنے کھرینڈ بھی نہیں کُھرچ سکتا کیونکہ اُس کی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ جب چراغ دین اپنا کتھارسس کرتا ہے تو تمام تر حساسی بیداری کے باوجود ماضی کے گرداب میں اپنی سمعی و بصری حسوں کو بروئے کار لاتا ہے اور شمو کی پاکیزگی کو باطنی آنکھ سے دیکھتا اور محسوس کرتا ہے۔ "شمو نے اپنی برہنگی چھپانے کے لئے اپنے بدن کو چیرا اور روح کو برہنہ کر کے اِس کے لہو کو اپنے بدن پر مل لیا۔ اب وہ پُرسکون ہو گئی تھی۔"(۱۸) ایک باشعور قاری محسوس کر سکتا ہے کہ ناول کا اسلوبِ بیان "ہجومی گروہ" کے تماش بین کلچر کی مذمت کرتا ہے۔ جو ملک ڈھمکانا کی لگائی گئی نمائشی پنچایت میں فیصلہ سُننے کے بہانے ظالم وٹھر کی تماش بین کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔

> گرد باد میں سماجی ٹھیکیداروں کے معاون ،ہجومی گروہی کلچر کی بابت یوں بیان ہوتا ہے کوئی تماشا تو ضرور ہونے والا تھا جسے دیکھنے کو خلقت اُمڈ آئی تھی۔۔۔ ہمیں اپنے سامنے پا کر کلف لگی پگڑیوں کے شملے ایک پھنکار کے ساتھ لہرائے اور ہمیں دائرے کے وسط میں بیٹھ جانے کو کہا گیا۔۔ شمو کی شہزادگی کب کی ہوا ہو چکی تھی۔۔۔ اب وہ شمو نہ سہی شمو کا سایہ سہی پر دلوں کو مسل دینے پر قادر تو وہ اب بھی تھی۔ اسی باعث سرپنچ ملک ڈھمکانا تیز تیز کش لیتا اس پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔(۱۹)

یہ وہ بیانیہ ہے کہ جو حواسی و حساسیتی سطحوں پر انسانی سماج کے لئے ایک بڑا سوالیہ ہے کہ وہ سرپنچ کہ جسے اپنے مذہبِ انسانیت کی خبر نہیں تو وہ انھی سطور پر وہ معمہ کیسے حل کر سکتے کہ جس کا جال بھی خود بُنا ہو۔ ڈاکٹر داؤد رہبر ایسی ہی سماجی ابتری کی تصویر یوں پیش کرتے ہیں کہ "کسی مذہب پر اغیار تو بغیر سوچے سمجھے فقرہ کس دیں گے اور اس کی کمزوریاں جتائیں گے حالانکہ خود اپنے دین کے مبادی سلجھے ہوئے لفظوں میں بیان نہیں کر سکتے۔"(۲۰) ناول گرد باد زمان و مکاں میں مثبت تحرک کا بیانیہ ہے۔ ناول نگار نے اِسے عام قاری کا کلامیہ بناتے وقت انقلابی مشاہدے کی فضا کو جنم دیا ہے اور سماج کی تاریخی، سیاسی و ثقافتی حقیقتوں کو آشکار کرنے کے لئے فطرت نگاری سے کام لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ "گرد باد" اپنے انجام تک پہنتے پہنچتے حقیقی معنوں میں "شوکتا وحشی گرد باد" بن جاتا ہے۔

وہ آزادیٔ فکر و نظر جو موجو اور چراغے کو شہر کی فضا میں دوغلے غلاف اُوڑھ کر حاصل ہوتی ہے وہی اپنے مقام و مکاں میں بھی ممکن تھی۔ گاؤں کی حیات وشناخت کے دعوایداروں نے یہ طے کرر کھا ہے کہ طبقے کی تقسیم کی بنا پر اخلاقیات میں تمام انسان بنیادی طور پر صلاحیتوں یا سماجی مرتبے میں بھی کمتر (کمیں) یا برتر (چوہدری) ہوتے ہیں۔ اگر مساواتِ انسانی واقعی نافذ کر دئے جائیں تو سماج کے اکثر چوہدری فلانے اور ملک ڈھمکانے تختہ دار پر ہوں۔ گرد باد کی صورت ناول نگار نے انسانی حسیات کو متاثر کن بیانیے میں جھنجھوڑا ہے، جس کے لئے کہانی کا اسلوب، مقامی بولی کی آمیزش سے مزید جاندار ہو جاتا ہے۔ کرداروں کے بھرپور ثقافتی گیٹ اپ نے ایک جاندار حساسیت کو جنم دیا ہے۔ لامحالہ طور پر ناول نگار نے سارتر کے اس قول کی تائید کی ہے کہ

> دُنیا لکھنے والے کی ذمہ داری ہے۔ وہ لکھتا ہے اور زیادہ سے زیادہ لکھتا ہے تا کہ دُنیا میں آزادی کا چلن عام ہو اور انسان پر انسانوں کا ظلم کم سے کم ہو تا جائے۔۔۔ لکھنے والا ہر اعتبار سے آزاد فرد کی حیثیت سے آزاد انسانوں سے مخاطب ہوتا ہے اور اس کا موضوع ایک اور صرف ایک ہوتا ہے، آزادی۔(۲۱)

حوالہ جات:

۱۔ وزیر آغا، ڈاکٹر، معانی اور تناظر، مجلس ترقی ادب، لاہور، جون ۲۰۱۶ء

۲۔ عاطف علیم، محمد، گرد باد، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۷ء، ص۔۱۳۷، ۱۳۵

۳۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ اور عورت، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص۔۲۷

۴۔ عاطف علیم، محمد، گرد باد، ص۔۲۴۵

۵۔ ایضاً، ص۔53 ۶۔ ایضاً، ص۔۹ ۷۔ ایضاً، ص۔۹۲

۸۔ عابدہ نسیم، ڈاکٹر، اُردو ناول اور مہاجرین کے مسائل، (۱۹۴۷ کے تناظر میں) انجمن ترقی اُردو پاکستان، کراچی ۲۰۱۸ء، ص۔۳۰۱

۹۔ گرد باد، ص۔۴۲، ۱۷، ۳۸

۱۰۔ معانی اور تناظر، ص۔347

۱۱۔ تاریخ اور عورت، ص۲۶، ۱۲۵

۱۲۔ ایضاً، ص۔۱۳۹ ۱۳۔ ایضاً، ص۔۱۳۲ ۱۴۔ ایضاً، ص۔۹۷

۱۵۔ فرخ ندیم، فکشن، کلامیہ اور ثقافتی مکانیت، عکس پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص۔۲۰

۱۶۔ گرد باد، ص۔۹۷

۱۷۔ ایضاً، ص۔۹۵ ۱۸۔ ایضاً، ص۔۱۳۴ ۱۹۔ ایضاً، ص۔۱۰۵، ۱۰۴

۲۰۔ داؤد رہبر، ڈاکٹر، کلچر کے رُوحانی عناصر، سنگِ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص۔۵۰

۲۱۔ جیلانی کامران، مغرب کے تنقیدی نظریئے (جلد دوم)، مکتبۂ کارواں، لاہور، ۲۰۰۰ء، ص۔۱۵۷